اقبال اور نوآبادیاتی نظام

ڈاکٹر رضوان احمد مجاہد

ABSTRACT:

Colonialism remained prevalent in the world from sixteen the to mid twentieth century and victimized a number of countries. How colonialism devastated fundamental human and birth rights of victimized nations is now a part of the antiquity. This article analytically focuses on the deadly consequences of colonialism in the light of Iqbal's philosophy and thought.

In Iqbal views, the nations brought up in slavery are devoid of the freedom of thought and self respect because colonialism not only exploits them economically but also intellectually. That is why the nations captured in the talons of slavery cut themselves off from their real identity and become morons intellectually.

نوآبادیاتی نظام کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی ریاست اپنی قوت کے بل پر کسی کمزور ریاست اور اُس کے لوگوں پر اپنی عمل داری قایم کر کے اس کے قدرتی وسایل اور وہاں کے افراد کی قوت و صلاحیت کو اپنی اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے فروغ کے لیے استعمال کرے تو وہ مقبوضہ ریاست اس قابض ریاست کی نوآبادی کہلاتی ہے یعنی نوآبادیاتی نظام ایک ایسا نظام ہے جس میں طاقت ور ریاست اور قوم، کسی کمزور ریاست اور قوم کو اپنے مفاد میں اپنی عمل داری میں لے لیتی ہے۔ قابض ریاست کا غلبہ مقبوضہ ریاست کے تمام تر قدرتی وسایل، تجارتی منڈیوں اور افرادی قوت پر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنی اقتصادی اور معاشرتی ترقی کو فروغ دیتی ہے۔

اقتصادی اور معاشرتی شعبوں کے علاوہ حکومتی انتظام چلانے والے ادارے بھی غالب ریاست کے اختیار میں آجاتے ہیں۔ یوں قابض ریاست اپنی نوآبادی پر مکمل بالادستی قایم کر لیتی ہے۔ اس بالادستی کو یقینی بنانے کے

لیے فوجی قوت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب ریاست اپنی نو آبادی سے معاشی و معاشرتی اعتبار سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ حربی اور سائنسی حوالے سے بھی وہ فوقیت رکھتی ہے۔

اپنی اس برتری کے بنا پر وہ مقبوضہ قوم کے مقابلے میں خود کو ایک بہتر قوم اور نسل گردانتی ہے۔ یہ احساس تفاخر اُس کے عزائم کو مزید مہمیز دیتا ہے اور وہ دوسری اقوام کو اپنے زیرنگیں کرنے اور اُن کے وسایل سے فیض یاب ہونے کو اپنا حق سمجھتی ہے۔

نو آبادیاتی نظام ایک اصطلاح ہے جو یورپی اقوام کی دیگر کمزور اقوام پر سیاسی گرفت اور اُن کے وسایل پر قابض ہونے کے طریق کار کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یورپی نو آبادیاتی نظام باقاعدہ طور پر سولھویں صدی میں وجود میں آیا اور اٹھارویں صدی تک اس استعماری نظام کی تشکیل ہوئی۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں برطانوی قوم نے دنیا کی مختلف کمزور اقوام کو اپنے تسلط میں لے کر نو آبادی بنایا اور اس طرح ایک مربوط نو آبادیاتی نظام کی بنیاد رکھ کر، دنیا کے تقریباً پچیس فیصد حصہ کو اپنا زیرِ نگیں بنا لیا:

> ''صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی اس نظام کے حوصلے مزید بلند ہوئے اور اس کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ تجارتی مسابقت اور نئی منڈیوں کی تلاش ، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، پرتگال اور اسپین کو امریکہ، ایشیاء، افریقہ اور آسٹریلیا کے بیشتر حصوں میں لے گئی۔ جہاں اُن قابض ممالک نے اپنی اپنی نو آبادیات قایم کیں۔ انیسویں صدی میں روس ، اٹلی، جرمنی اور خود امریکہ بھی ان استعماری ممالک کی صف میں شامل ہوئے'' (۱)

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی یعنی دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر نو آبادیاتی نظام کی گرفت کمزور ہونا شروع ہوئی اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں آزادی کی موثر تحریکوں نے اس نظام کو اپنے منطقی انجام تک پہنچا دیا۔

نو آبادی انگریزی زبان کے لفظ کالونی (Colony) کا ترجمہ ہے ۔ سیاسی اصطلاح میں کالونی مقبوضہ اور مطیع علاقے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کالونی کی اصطلاح لاطینی لفظ (Colonia) سے مستعار ہے۔ جس کے معنی کسی علاقے پر قابض ہو کر ایک منظّم گروہ کی سکونت کے ذریعے کسی انسانی معاشرے کی نو آبادکاری ہے ۔ (۲)

اپنے سیاسی مفہوم میں کالونی ایک جغرافیائی وحدت ہے جو نو آبادکار ریاست یعنی استعماری ریاست سے آزاد ہو کر بھی کسی نہ کسی حیثیت میں اس کی وفادار اور مطیع رہتی ہے'' (۳)

نو آبادیوں کا وجود تجارت ، معیشت، فتوحات اور سائنس و ٹیکنالوجی کی برتری کا مرہونِ منت رہا ہے۔ ماضی کی تمام نو آبادیوں کا جائزہ لیا جائے تو ایک حقیقت نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ کسی بھی نو آبادی کا حقیقی باشندہ عام طور پر بنیادی سیاسی حقوق سے محروم رہا ہے۔ تاہم کچھ سیاسی و معاشی سہولتیں اور کسی حد تک خود مختار حکومت کا حق اُسے آبادکار ریاست کی مرضی سے ضرور ملتا رہا ہے۔

شاید انہیں سہولیات کے پیش نظر ،نو آبادیاتی نظام کے حمایتی اس بات کا پرچار کرتے ہیں کہ آبادکار ریاست اپنی نو آبادیوں میں اقتصادی اور سیاسی نظام کا ڈھانچہ ازسرنو مرتب کرتی ہے ۔ اُن کے بقول انہیں نو آبادکاروں کا

جدید دنیا سے ہم آہنگ ہونے اور جمہوری اقدار کے حصول کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ نو آبادیاں آج جدیدیت اور جمہوریت سے ہم آہنگ ہوکر ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہو چکی ہیں۔

اس سلسلے میں امریکہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، ہانگ کانگ اور سنگاپور کو مابعد نو آبادیات ترقی یافتہ ریاستوں کی مثال قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن دنیا کے یہ ترقی یافتہ ممالک جو بذات خود عالمی تجارتی مراکز بھی ہیں، نو آبادیاتی نظام کے اثرات کی حقیقی تصویر پیش نہیں کر سکتے۔ اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ نو آبادکار ریاستوں نے جن غیر آباد علاقوں میں اپنی نو آبادیاں قایم کیں اور وہاں اپنے ممالک کے باشندوں کو آباد کیا۔ اُن کی ترقی اور اُن نو آبادیوں، جنھیں قوت کے زور پر اپنا زیرنگیں بنایا۔ ان کی ترقی میں آج بھی زمین آسمان کا فرق موجود ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ریاستوں کی توسیع کے عمل کے دوران میں پس ماندہ ریاستوں کو نہ صرف محکومیت کے عذاب سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ معاشی اور اقتصادی استحصال کے ساتھ وہاں کے عوام کی نفسیاتی، معاشرتی اور اخلاقی زندگیوں کو بھی ایک اندوہ ناک کرب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک رائے کے مطابق تو نو آبادیاتی نظام کی تخریب کاری کسی عصمت دری کے مترادف ہے۔(۴)

نو آبادیاتی دور انسانی تاریخ کے بدترین ادوار میں سے ایک دور تھا۔جس میں انسانیت کی بیخ کنی کی گئی۔ نو آبادیاتی نظام کے استحکام کے لیے برس ہا برس کی جنگیں اور بے رحم جارحیت کا سہارا لیا گیا۔ایک تہذیب کی قیمت پر دوسری تہذیب کو پروان چڑھایا گیا۔

آزادی فکروعمل کو ختم کر کے صاحبِ فکرو دانش افراد کے سر فصیل وقت کی زینت بنائے گئے۔مقامی افراد کی تذلیل ونفرت اس نظام کا طرۂ امتیاز سمجھا گیا۔ غرض نو آبادیاتی نظام قایم کرنے کا عمل ایک انسانیت کش عمل تھا۔ جس میں محکوم انسان آقاؤں کے سامنے جانوروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اس نظام کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسانوں میں صرف حاکم ومحکوم کا رشتہ ہی ایک حقیقی رشتہ ہے۔ اس نظام کے تحت انسانیت کی تحقیر کے نت نئے حربے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ ٹیکس، خوف و ہراس کی فضا، پولیس کا تشدد و نا انصافی، ذرائع ابلاغ پر گرفت، جس کے ذریعے یہ باور کراتے رہنا کہ نو آبادیاتی نظام کے ذریعے ہی نئی تہذیب اور ترقی کا عمل ممکن ہو سکا ہے یہ احساس دلانا کہ نو آبادیاتی نظام کے بغیر جدیدیت کا تصور بھی محال تھا۔

حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، ماضی کی نو آبادیوں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ جدیدیت کے لحاظ سے آج بھی سیکڑوں برس پیچھے ہیں۔نو آبادیاتی نظام کے خالق آج بھی اپنا اثر ورسوخ قایم رکھنے کے لیے مختلف سامراجی ہتھکنڈے اپنائے ہوئے ہیں۔نو آزاد ریاستیں اپنے اقتصادی معاملات میں آج بھی سرمایہ دارانہ استعماری نظام میں جکڑی ہوئی ہیں۔مغربی سامراجی نظام کی کامیابی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے والی ریاستیں اب بھی نو آبادیاتی معاشی نظام سے آزاد نہیں ہوسکی ہیں۔

موجودہ نو آبادیاتی نظام یعنی امپیریل ازم، باقاعدہ ایک نظریہ کے تحت منظّم کیا گیا ہے۔عصر حاضر میں جب

کہ سرد جنگ کے خاتمہ پر امریکہ ایک یک قطبی طاقت بن کر ظاہر ہوا ہے اور جس کا بڑا اتحادی یورپ ہے۔ یوں یورپ امریکہ گٹھ جوڑ، نئے امپیریل ازم کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ اس نئے امپیریل ازم میں جدید سائنس اور طاقت کی بدولت نو آبادیات پر تسلط نئے ڈھنگ سے مستحکم کیا گیا ہے۔ آج یورپی، امریکی طاقت وتشدد کے سامنے اقوام عالم بے بس وحقیر دکھائی دیتی ہیں۔(۵)

یہ مما لک بین الاقوامی امداد، قرضوں، جدید ٹیکنالوجی کی منتقلی، تجارتی منڈیوں میں قیمتوں پر کنٹرول اور بین الاقوامی اداروں، ورلڈ بنک، آئی ایم ایف اور یورپی یونین کے ذریعے نئے امپیریل ازم کا جال پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ جال ماضی کے نو آبادیاتی نظام کی طرح بظاہر نظر نہیں آتا لیکن بالواسطہ طور پر کہیں زیادہ مستحکم اور با اثر ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں جبکہ برطانوی نو آبادیاتی نظام اس قدر مستحکم تھا کہ برطانوی اقتدار میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں اسی برطانیہ کی نو آبادی، ہندوستان میں جنم لینے والا صاحبِ فہم وادراک شاعر، علامہ محمد اقبال، امت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے کمر بستہ ہو چکا تھا۔ نو آبادیاتی نظام اور اُس کے اثرات کے حوالے سے اقبال اپنی گہری فکری بصیرت اور سیاسی تجزیے کی بنا پر اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ آنے والے دنوں میں امت مسلمہ پر نو آبادیاتی نظام کے اثرات کس قدر مہلک ثابت ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایک تہذیبی اکائی بننے کی دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

اقبال اپنے عہد کی سیاست کا گہرا شعور وادراک رکھتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک قوم جو ایک عرصہ سے نو آبادیاتی نظام کی پروردہ ہے، اُس کی اخلاقی وتہذیبی سطح کس حد تک دگرگوں ہو چکی ہے۔ اقبال جس تہذیب وثقافت کے گرویدہ تھے۔ وہ دردمندی اور اخوت کی علم بردار تھی۔ جس کی بنا پر مسلمان ایک دوسرے کے لیے بریشم کی طرح نرم اور دشمن کے لیے فولاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اقبال ایسی تہذیب وثقافت کے متمنی تھے جو مادیت سے کہیں زیادہ روحانی اقدار پر مبنی ہو۔ اُن کے نزدیک روحانی زندگی کے لیے ایسی تب وتاب چاہے جو نہ ختم ہونے والی ہو۔ جس کی بنیادیں قرآن سے ماخوذ ہوں اور حصول علم ودانش، جستجو اور آرزو جس کے بنیادی خواص ہوں۔

اقبال کے نزدیک ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دل میں جستجو وآرزو کا چراغ روشن کرے تاکہ وہ ایک زندہ انسان کی مثال بن سکے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ نو آبادیاتی نظام کے شکنجے میں جکڑے رہنے کی وجہ سے اُس میں حزم واحتیاط کی ضرورت سے بڑھی ہوئی کیفیت اور بے دلی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ اقبال اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر اس حقیقت کا ادراک کر چکے تھے کہ نو آبادیاتی نظام نے مسلم امہّ اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اُن کے ماضی کی درخشاں روایات کا احساس تفاخر، ندامت وپشیمانی میں بدل چکا تھا۔ اُن کے ماضی کی مضبوط اور بے باک شخصیت بودے پن کا شکار ہو چکی تھی۔ بے یقینی بذات خود غلامی سے بدتر ہے۔

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی ، خود گُزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی (۶)

اُن کا درس خودی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، انہوں نے فلسفہ خودی کے ذریعے انسان کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہی درحقیقت خلاصۂ کائنات ہے اور کائنات کی تخلیق اسی کی مرہونِ منت ہے۔

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے (۷)

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے (۸)

اس حوالے سے قاضی جاوید کا اقتباس توجہ طلب ہے:۔

''علامہ کی شاعری میں نو آبادیاتی نظام کے نفسیاتی اور عمرانیاتی اثرات کی موثر تصویر کشی کی گئی ہے۔ خودی کے تجزیاتی فہم کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے''(۹)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''نظریہ خودی کی تشریح وتوضیح کی جانب کافی توجہ دی گئی ہے۔ تاہم اس حقیقت کو مسلسل نظر انداز کیا گیا ہے کہ یہ تصور براہ راست نو آبادیاتی نظام کے خلاف ایک ردعمل ہے۔ خود علامہ نے اس جانب کئی اشارے کیے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ صرف خودی کی موت کی بنا پر ہندی شکستہ بالوں پر آشیانہ حرام اور قفس حلال ہوا ہے اور یہ کہ ہر وہ قوم جو اپنی خودی کی حفاظت نہیں کر سکتی۔مظلومی ومحکومی کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ اُس کا ناگزیر مقدر ہے۔ اس سے نجات کی راہ صرف خودی کی پرورش اور لذت نمود میں ہے۔''(۱۰)

لٰہذا اقبال کے نزدیک انسان پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنی خودی کا ادراک کرے اور خودی کی اس حقیقت کا ادراک بغیر علم و جدان ممکن نہیں ہے۔ اقبال جس خودی کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف انسان کی انفرادی خودی ہے بلکہ خدا کی خودی بھی ہے۔ کیونکہ خدا کی ذات خودی مطلق ہے اور خود اپنے انکشاف کی خواہشمند بھی ہے۔(۱۱)

احساس خودی کے فقدان کی وجہ سے قوموں پر مرتب ہونے والی غلامی کی نفسیات، جو تباہی و بربادی کا پیغام لاتی ہے۔ اقبال اس سے بخوبی آگاہ تھے۔

اقبال نو آبادیاتی نظام کے نتیجے میں جنم لینے والی ملوکیت اور اُس کے، اُن حیلے بہانوں سے بھی واقف

تھے۔ جو وہ مختلف اقوام کو غلامی پر رضا مند رکھنے کے لیے اختیار کرتی ہے۔ اقبال اس حقیقت کو بھی جانتے تھے کہ انسانیت، جمہوریت اور انصاف کے نام پر استحصال اور مکروفریب ہی ملوکیت کی اصل نفسیات ہے۔''خضرِ راہ'' میں اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

آ بتاؤں تجھ کو رمز ِ آیہء ان الملوک
سلطنت ِ اقوامِ غالب کی ہے اک جادو گری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری (۱۲)

اقبال کے خیال میں نو آبادیاتی نظام اپنے معاشی اور سیاسی مفادات کی حفاظت کے لیے ابلیسی ضابطہ ٔ اخلاق ترتیب دیتا ہے۔ اور اس ابلیسی ضابطہ ٔ اخلاق کے زیرِ اثر ملوکیت ، شہنشاہیت اور غیر ملکی حکمرانی کے انداز، مقامی باشندوں اور مقبوضہ ریاستوں کے نادار عوام کی شکستہ حالی اور اُن کی تقدیر کی جبریت پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔

اقبال کے نزدیک یہ ابلیسی ضابطہ ٔ اخلاق ، مقامی باشندوں میں خوئے غلامی کی ترویج کا باعث بنتا ہے۔ اسی ضابطہ ٔ اخلاق کے ذریعے صوفی و ملا سے ملوکیت کے حق میں کلمہ ٔخیر کہلوایا جاتا ہے۔

جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مردِ حر کے لیے زندگی تنگ اور اُس کی جدوجہد کو حرام قرار دیدیا جاتا ہے۔

اقبال جانتے تھے کہ جب ان استعماری و قابض قوتوں کو مقامی مدد اور تعاون درپیش ہوتا ہے تو یہ سلطانی جمہور کا نعرہ ٔ مستانہ لگا کر اپنا چولا بدل لیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اس جمہوری نظام کی حقیقت سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ ''چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر'' (۱۳) اقبال استعماری دور کے ان ہتھکنڈوں سے بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ جن کی بدولت یہ قوت مذہبی، سیاسی، معاشی، تاریخی اور تہذیبی چالوں کے زیرِ اثر ملا کی نظر، نور فراست سے تہی کر دیتی ہے۔ صوفی کی مئے ناب بےسوز ہو جاتی ہے۔ اقبال بہت کرب سے اس تلخ حقیقت کا ادراک کرتے ہیں کہ نو آبادیاتی نظام کا زہر محکوموں کی رگ و پے میں اتر کر، اُن کا دل مردہ، افسردہ اور نا امید کر دیتا ہے۔ نتیجتاً وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنا ضمیر گروی رکھوا دیتا ہے اُس کی نمناک آنکھوں سے اخلاص و مروت کی رمق تک رخصت ہو جاتی ہے۔ غرض نو آبادیاتی نظام کے زیرِ اثر استعماری رنگ ڈھنگ، مقامی تہذیب و وقار کو ساکت، جامد و بےعمل کر دیتا ہے۔

اقبال دیکھ رہے تھے کہ نو آبادیاتی نظام کی عطا صدیوں کی غلامی نے مسلمانوں کی تازگی ٔ فکروعمل کو گہنا دیا ہے۔ اقبال نہ صرف غلامی کے اس مرض کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ اس کے تباہ کن اثرات کا جائزہ بہت دروں بینی سے لیتے ہیں۔ وہ آزادی کی افادیت واہمیت بھی اجاگر کرتے ہیں تاکہ آمادہ ٔ غلامی قوم پھر سے آزادی ٔ فکرو عمل کے لیے بےتاب ہو جائے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے مثل جوئے آب

اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں (۱۴)

فکرِ اقبال میں غلامی کے خلاف جو شدید ردِعمل ملتا ہے اور جس طرح وہ اپنی قوم کو غلامانہ طرزِ زیست اور اندازِ فکر کے خلاف آمادہ پیکار کرتے ہیں، وہ دراصل نو آبادیاتی نظام کی عطا ،فکری و عملی کجروی کے خلاف شدید ردِ عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال ایسے افراد سے سخت بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جو مغربی فکر و عمل کے گرویدہ تھے۔ سید سلمان ندوی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں''مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے'' (۱۵)

اس دور میں جب مغربی تہذیب ، سیاسی وفکری اور اقتصادی و معاشرتی میدانوں میں ، دل و دماغ پر چھا جانے کے لیے معرکہ آرا تھی۔ اقبال نے مغربی تہذیب و افکار اور فلسفہ ونظریات کا نہایت باریک بینی اور دقت نظری سے مطالعہ کیا اور مغربی تہذیب کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کر کے اسلامی تصورات اور تہذیب کی برتری کو واضح کیا۔

اقبال کے نزدیک ذہنی وفکری طور پر مغرب سے مرعوب طبقہ مسلمانوں کی سیاسی راہنمائی کا اہل نہیں ہے ۔ بلکہ مسلم معاشرے میں فکری ارتداد کا باعث ہے۔ یہ طبقہ ذاتی مفادات کے پیش نظر قومی مفادات کا سودا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔حقیقت یہ ہے کہ نو آبادیاتی نظام ، مقامی لوگوں کے تعاون کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس لیے اس نظام کی بقا کے لیے ایک ایسا طبقہ ازحد ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ جو ذہنی اعتبار سے مغربی فکر و فلسفہ کا داعی ہو اور رنگ ونسل کے لحاظ سے مقامی۔ اقبال جانتے تھے کہ غلام چاہے جسمانی ہوں یا ذہنی و معاشی اُن کی سوچ اپنی نہیں ہو سکتی وہ اپنے آقا کی عینک سے دیکھتے اور اس کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ وہ اپنے فائدوں کی خاطر ، استعمار کے مفادات کا تحفظ یقینی بناتے ہیں۔ ملک وملت داؤ پر بھی لگ جائے تو خیال نہیں کرتے ۔

اقبال قوم کو مغرب کے ان آلہ کاروں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں وہ غلاموں کی بصیرت سے پناہ مانگتے ہیں اور مردانِ حر کی تمنا کرتے ہیں:

یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں
غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں، خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں (۱۶)

یہی وجہ ہے کہ نو آبادیاتی ماحول کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والے فنونِ لطیفہ کی حیثیت بھی اقبال کے نزدیک مشکوک ٹھہرتی ہے اور وہ اُس دور میں پروان پانے والے ادب،مصوری اور سنگ تراشی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اُس دور میں وجود پانے والی تصویریں، چہرے اور خاکے استعماری نظریات کے عکاس ہوتے ہیں۔حقیقت میں یہ فنونِ لطیفہ، استعماری حاکموں،مفکروں اور دانشوروں کی سوچ کے بموجب ہوتا ہے۔اس کے

ساز میں موت کا آہنگ اور جہاں سے بیزاری کا رنگ جھلکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک غلامی ذوقِ حسنِ زیبائی سے محرومی کا دوسرا نام ہے۔ یہ انسان کو کند ذہن بنا کر حسنِ لطافت سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اس کے باطن سے سوائے بے دلی نا توانی اور خستہ حالی کے کچھ نہیں پھوٹتا۔

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسنِ زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا (۱۷)

اقبال نے نو آبادیاتی نظام کے اثرات اور مسلمانوں کی زبوں حالی کو شعوری سطح پر سمجھا اور انہیں تہذیبی اکائی بننے کی دعوت فکر دی ۔ اقبال استعماری دور میں پھیلائے گئے تہذیبی جالوں کا بہت باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔

وہ دیکھتے ہیں کہ اس تہذیب کے زیر اثر ایک ایسا طبقہ پروان چڑھ رہا ہے ۔ جو ظاہری چمک دمک ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک مغرب کی ترقی، اُس کے لباس اور عیش وعشرت میں پنہاں ہے۔

اقبال جانتے تھے کہ نو آبادیاتی نظام کے زیر اثر پروان چڑھنے والے معاشرے، جو خود اپنی خودی سے تہی ہو چکے ہوں۔ انھیں دوسروں کی ذراسی خوبی بھی بہت بڑی محسوس ہوتی ہے۔ اور اس کے برعکس وہ اپنی بڑی سے بڑی خوبی کو بھی اپنے احساس کمتری کی وجہ سے نہایت حقیر خیال کرتے ہیں۔

اقبال اپنی مثنوی پس چہ بایدکرد۔ اے اقوامِ شرق ، میں جہاں اور بہت سے نکات پر بات کرتے ہیں۔ وہاں اس نکتہ کو بھی بہت صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ ہمیں مغرب کی ظاہری چمک دمک کے سامنے اپنی تہذیب اور دین کو فراموش نہیں کر دینا چاہیے۔ بلکہ اپنی تہذیب اور دین پر فخر کرتے ہوئے اُن کی خوبیوں پر عمل پیرا ہونا چاہیے کیونکہ یہ وہی روشنی ہے، جس نے تہذیب مغربی کے دیے کو روشن کر رکھا ہے اور مغرب کی مستی اسی مئے گلفام کی بخشی ہوئی ہے۔ مغرب کی خوشحالی اور ترقی کی عمارت کا معمارِ اوّل بھی یہی تہذیب اور دین ہیں۔

اے زافسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہادر آستینِ اونگر
ازفریب او اگر خواہی اماں
اشترانس رازِ حوضِ خودبراں
حکمتش ہر قوم رابے چارہ کرد
وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد (۱۸)

ترجمہ: تو جو فرنگی کے سحر سے بے خبر ہے۔ اس کی آستین دیکھ کہ اس میں ہزاروں تباہیاں پوشیدہ ہیں۔ اگر تو اس کے طلسم سے محفوظ رہنا چاہتا ہے تو اپنے حوض سے اس کے اونٹوں یعنی کینہ

پروروں کو بھگادے۔ اس کی تدبیر اور چالوں نے ہر قوم کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ اسی نے عربوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ (۱۹)

اقبال اپنی اسی مثنوی میں لکھتے ہیں:

عصر حاضر زادۂ ایام تست
مستی اوازمے گلفام تست
شارح اسرار او تو بودۂ
اولیں معمار او تو بودۂ
مردِ صحرا پختہ ترکن خام را
بر عیار خود بزن ایام را (۲۰)

ترجمہ: موجودہ دور (اپنے علوم کے سلسلے میں) تیرا ہی مرہونِ منت ہے۔ اس کی مستی تیری ہی سرخ شراب کے طفیل ہے۔ پہلے پہل اس کے بھیدوں کی تشریح کرنے والا تو ہی تھا۔ اس کا پہلا معمار بھی تو ہی تھا۔ اے صحرانشین (یعنی عرب قوم) اپنی کوتاہیوں کو دور کر کے خود کو قوت و جبروت کا حامل بنا۔ زمانے کو اپنی کسوٹی پر پرکھ۔ (۲۱)

اقبال نے نوآبادیاتی نظام کے استعماری ہتھکنڈوں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور اس کے خلاف اپنے فکری استحکام کو بروئے کار لاتے ہوئے باقاعدہ اعلانِ جنگ کیا ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مغربی استعمار کی یلغار میں منافقت، خود فروشی اور استبداد کے عناصر کس قدر پیش پیش ہیں۔ انھوں نے اس موقع پر بغیر لگی لپٹی رکھے، اسلام کو ایک عالمگیر انسانی تحریک کے طور پر پیش کیا ہے۔ انھوں نے کسی قسم کا معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کیے بغیر اسلام کو عالم انسانیت کی فلاح اور خیر وخوبی کا ضامن قرار دیا ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے استعماری تسلط کے برعکس، اقبال حقوقِ انسانی، عظمتِ بشر، آزادیِ ضمیر اور حق خودارادیت کے قایل تھے۔ اُن کے نزدیک اسلام صلحِ کُل اور عالمگیر مساوات پر مبنی تہذیب و معاشرت کا داعی دین ہے اور اسی کو اپنا کر زمانے کے دکھ اور درد کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اقبال جانتے تھے کہ اسلامی تہذیب ہی وہ تہذیب ہے جو رنگ ونسل اور طبقات کی تمیز سے ماورا ایک ایسا مستحکم معاشرہ تشکیل دے سکتی ہے جو کسی بیرونی حاکمیت اور سامراجی حربوں کے زیرِ اثر نہ ہو سکے گا یہی وہ معاشرہ ہے جو بیرونی عمل داری اور دیو استبداد کے ہر قسم کے امکان کو جھٹک دے گا۔ اقبال کسی بھی صورت استحصالی آقایت کے قایل نہ تھے۔ وہ حکمت فرعونی کو حکمت کلیمی کے زیرِ اثر دیکھنے کے متمنی تھے۔ اقبال نوآبادیاتی نظام کی روح کے برعکس، جس نے عالمِ بشریت کی پیٹھ میں انتشار اور محرومی کا خنجر پیوست کیا تھا۔ اسلام کو ایک ایسی قوت اور روحانی نظام کے حوالے سے یاد کرتے ہیں، جو انسانیت کو متحد و یکجا کرنے کا خواہاں ہے۔ اس حوالے سے اقبال لکھتے ہیں:۔

''اگر عالم بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جانا ہے تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن

میں نہیں آ سکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رُو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد و عادل ہے کہ قدیم زمانے میں 'دین' قومی تھا، جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا بعد میں نسلی قرار پایا، جیسے یہودیوں کا، مسیحیت نے یہ تعلیم دی کی دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کی دین چونکہ پرائیوٹ عقائد کا نام ہے۔ اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف سٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظّم کرنا ہے۔'' (۲۲)

جہاں تک نو آبادیاتی نظام کے مابعد اثرات کا تعلق ہے تو یہ نظام آج بھی مختلف شکل میں اپنا تسلط برقرار رکھے ہوئے ہے۔ آج بھی مغرب کی نام نہاد تہذیب یافتہ اقوام پسماندہ اقوام کے ساتھ ظلم و جبر اور وحشت و بربریت کا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ یہ مغربی استعمار کی خوں ریزی اور سفاکی ہی ہے جو فلسطین، کشمیر، افغانستان، عراق اور لبنان کو پامال کیے ہوئے ہے۔ اقبال اپنی فکری بصیرت کے سبب مغربی استعمار کی ان خوں آشامیوں کو بہت پہلے دیکھ چکے تھے۔

اُن کے نزدیک نہ صرف برصغیر بلکہ تمام مشرق کی زوال آمادگی کا بنیادی سبب مغربی استعمار ہی ہے۔ جس نے مشرق کی روح کو انتہائی بے دردی سے کچل کر رکھ دیا ہے۔ اور جس نے اپنی حکمت و دانائی اور تمام تر بے مثال سائنسی ترقی کے باوجود انسانیت کو زخم زخم کر دیا ہے۔ اقبال کی یکم جنوری ۱۹۳۸ء کی ایک ریڈیائی تقریر کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ جسے آج کے حالات و واقعات کے تناظر میں دیکھیں تو اسی عہد کا نوحہ محسوس ہوتا ہے۔ کہتے ہیں:۔

'' دور حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے اور یہ فخر یقیناً حق بجانب ہے۔ تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت سپرد کی گئی ہے، وہ خوں ریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ وہ اخلاقِ انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں۔ انھوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگان، خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا اور صرف اس لیے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا

سامان بہم پہنچایا جائے۔ انھوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد اُن کے اخلاق، ان کے مذہب، اُن کی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور اُن کے اموال پر دست تطاول دراز کیا۔ پھر ان میں تفرقہ ڈال کر ان بدبختوں کو خوں ریزی اور برادرکُشی میں مصروف کر دیا تا کہ غلامی کی افیون سے مدہوش رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ اُن کا لہو پیتی رہے۔'' (۲۳)

انسانیت کی تذلیل اور استعماری بربریت کا ذکر کرتے ہوئے اقبال مزید کہتے ہیں:۔

'' دنیا پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا کے ہر گوشے میں چاہے وہ فلسطین ہو یا حبش، ہسپانیہ ہو یا چین، ایک قیامت برپا ہے۔ لاکھوں انسان بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدنِ انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ وخون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں وہ اقتصادی میدانوں میں خون کا آخری قطرہ تک چوس رہی ہیں۔'' (۲۴)

حوالہ جات:

(۱) مبارک علی، ڈاکٹر، **تاریخ اور ریاست** (مضمون امپیریل ازم کیا ہے؟) فکش ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء ص ۷۵

(2) Encyclopadia of Social Sciences Vot III The Macmillen Company New York, 1963 pp 653

(۳) ایضاً ص ۶۵۶

(4) Colonialism www.wikipedia.com. p. 1 of 3

(۵) مبارک علی، ڈاکٹر، **تاریخ اور آج کی دنیا** (مضمون کولونیل آئیڈیالوجی اور اس کی بنیادیں) فکش ہاؤس لاہور، ۲۰۰۵ء ص ۳۷ تا ۵۲

(۶) اقبال علامہ محمد، **کلیات اقبال** (اردو) اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۴ء ص ۴۰۶

(۷) ایضاً ص ۲۲۰

(۸) ایضاً ص ۳۷۹

(۹) قاضی جاوید، **سر سید سے اقبال تک**، **تخلیقات**، لاہور، ۱۹۹۸ء ص ۲۳۳، ۲۳۵

(۱۰) ایضاً

(۱۱) خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، **فکرِ اقبال**، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۳۷۷

(۱۲) اقبال، علامہ محمد، **کلیات اقبال** (اردو) ص ۲۸۹

(۱۳) ایضاً ص ۷۰۴

(۱۴) ایضاً ص ۲۸۸، ۳۰۱

(۱۵) اقبال، علامہ محمد، **اقبال نامہ**، جلد اوّل، مرتبہ شیخ عطااللہ، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۴۴ء ص ۱۶۹
(۱۶) اقبال، علامہ محمد، **کلیات اقبال** (اردو) ص ۱۸۹
(۱۷) ایضاً ص ۳۶۱
(۱۸) اقبال، علامہ محمد، پس چہ باید کرد مع مسافر، ترجمہ ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، اقبال اکادمی، لاہور ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۴، ۱۴۵
(۱۹) ایضاً
(۲۰) ایضاً ص ۱۴۸، ۱۴۹
(۲۱) ایضاً ص ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰
(۲۲) اقبال، علامہ محمد، **مقالات اقبال** (جغرافیائی حدود اور مسلمان) مرتبہ عبدالواحد معینی، سید، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۳۶۵
(۲۳) اقبال، علامہ محمد، **حرف اقبال**، مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم ثنا اللہ خاں انشا پریس، لاہور، ۱۹۵۵ء ص ۲۲۳
(۲۴) ایضاً ص ۲۲۴